

رضاء علی عابدى

ٹین كا خالى ڈبّا

خدا خدا كر كے اسكول كى عمارت كا مسئلہ حل ٲوا اور اُس نے ميرے خواب ميں آنا چھوڑا۔ مگر ٹين كے ڈٲے كا مسئلہ كسى حال حل ٲونے كو نهيں آتا۔ وه بد ستور خواب ميں آئے چلا جاتا ٲے۔ اسكول كا تو يه تھا كه اس كے در و ديوار نظر آتے تھے۔ ٹين كا ڈبّا نظر نهيں آتا، خواب ميں اس كى صرف آواز آتى ٲے۔

اسكول ميرے لڑكپن كا اسكول تھا۔ كيسى اچھى سرخ اينٲنوں اور سرخ كھٲريلوں كى عمارت تھى۔ كيسے اچھے سرخ اينٲنوں كے فرش اور گلاب اور گيندے كى كيارياں تھيں۔ كيسے اچھے كلاس روم، كتنا عمدہ بڑا سا ٲال اور كيسا گھنا وه درخت تھا جس كے نيچے ٲر صبح سارے لڑكے قطار بنا كر كھڑے ٲوتے تھے اور ”سارے جهاں سے اچھا ...“ گايا كرتے تھے۔ كسى كے سُر اِدھر جاتے تھے اور كسى كى تان اُدھر ليكن اچھا لگتا تھا۔

اس كے بعد چوتھى جماعت كے ٹيچر مسٲر سائمن صبح كے اخبار كى خاص خاص خبريں ٲڑھ كر سناتے تھے۔ انھوں نے جاپان كے كسى جزيرے ٲر ايك ايسے بَم كے گرنے كى خبر سنائى تھى جو صرف ايك ذرّے سے بنا تھا ليكن جس نے ٲورا جزيرہ تباہ كر ديا تھا اور سارى آبادى كو مار ڈالا تھا۔

وه ٲيڈماسٲر كے كمرے كى چھت كے اوٲر لگا ٲوا گھنٲه جو سنا ٲے كه انجنيرنگ كالج كے لڑكوں نے ڈھالا تھا۔ وه بڑا سا كھيلوں كا ميدان جس ميں سنا ٲے كه ايك بار كوئى ٲوائى جهاں اُتر آيا تھا۔ دوسرى جانب ٲاسٲل كى عمارت اور چار ديوارى كے ٲچھوڑے وه كچّى سڑك جس ٲر دھول اُڑاتى ٲوائى بيل گاڑياں گئے لادے گزرا كرتى تھيں۔

وه سب ميرے وجود سے چمٲا چمٲا چلا آيا اور اسكول نے ٲر رات خواب ميں آنا شروع كر ديا۔ كبھى يوں نظر آتا كه عمارت ميں توسيع ٲو رٲى ٲے۔ كبھى دكھائى ديتا كه ايك بالائى منزل بھى بن گئى ٲے۔ بس جب بھى نظر آئى، ترقّى ٲى نظر آئى۔

ٲورے ٣٥ سال بعد جب ميں واپس گيا اور اسكول كے زمانے كے دوستوں سے ملا تو كوئى گنجا ٲو چكا تھا، كسى كى كمر جُھك گئى تھى، كسى كے بال سفيد ٲو گئے تھے اور

چشمہ تو پر ایک نے لگا رکھا تھا۔ جب اچھی طرح گلے مل چکے اور دوستوں کی بیویوں نے پوچھا کہ کیا کھائے گا، اُس وقت میرے جواب نے انہیں حیرت میں ڈال دیا۔ میں نے کہا کہ خدا کے لیے پہلے چل کر مجھے اسکول دکھا دو۔ ایک بار دیکھ لوں تو شاید وہ خوابوں میں آنا چھوڑ دے۔

جہاں ہم سب صبح صبح پیدل جایا کرتے تھے اور سہ پہر کو پیدل لوٹا کرتے تھے، اُس روز سب کاروں میں بھر کر وہاں گئے۔ کاروں میں ہم سب اور آگے پیچھے، دائیں بائیں اسکوتروں پر دوستوں کے جوان بیٹے۔

جا کر اسکول دیکھا۔ کاش نہ دیکھا ہوتا۔ وہ ٹوٹ چکا تھا، پھوٹ چکا تھا۔ نہ توسیع ہوئی تھی، نہ دوسری منزل بنی تھی، بلکہ بڑے ہال اور سائنس روم کی چھتیں گر چکی تھیں، حیران ہوں کہ انہیں کیا ہوا؟

ہاں مجھے یہ ہوا کہ وہ دن اور آج کا دن، پھر کبھی اسکول خواب میں نہیں آیا۔ شاید ہم دونوں نے ایک دوسرے کا پیچھا چھوڑ دیا۔ اس طرف سے اطمینان ہوا اور میں چین سے سونے لگا، مگر اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس ٹین کے ڈبے کا کیا کروں۔

جاڑوں کی رات تھی اور جاڑے بھی لندن کے۔ ایک تو پت جھڑ، اوپر سے رات کی تیز ہوائیں۔ سڑک کی پیلی پیلی روشنیاں دھندلائی ہوئی سی تھیں اور باہر سناتا پڑا تھا۔ ہوا کا شور تو کم تھا البتہ سوکھے پتے اڑنے کی آواز یوں آ رہی تھی جیسے کوئی مجمع اپنی مرضی کے خلاف تالیاں بجا رہا ہو۔ نہ کسی کے قدموں کی آواز تھی، نہ کتے بھونک رہے تھے اور وہ جو رات کے دوران اِگا اِگا دُکا کاریں گزر جاتی ہیں اُس رات وہ بھی نہیں گزر رہی تھیں۔ اتنے میں کہیں سے ایک آواز آئی۔ گلی کے ایک سرے سے ٹین کے ایک خالی ڈبے نے لڑھکنا شروع کیا۔ ہوا تیز ہوتی تو وہ بھی تیزی سے لڑھکتا۔ ہوا سست پڑ جاتی تو وہ بھی ذرا سا سرک کر رہ جاتا۔

اس کی آواز سے یہی گمان ہوتا تھا کہ خالی پے لیکن شاید اُس کے اندر تھوڑا سا پانی وانی بھرا ہوا تھا کیونکہ اس کی آواز ذرا ذرا بوجھل تھی۔ کبھی ٹین کا ڈبّا تنہا لڑھکنے کی آواز آتی۔ کبھی کبھی صرف پتے اڑنے کا شور ہوتا۔ پھر ذرا دیر کے لیے ان دونوں کی آوازیں اکھٹی آئیں۔

ایک بار آواز سے یوں لگا کہ ڈبّا لڑھکتے لڑھکتے سوکھے پتوں کی کسی ڈھیری میں

پھنس گیا ہے۔ اِک ذرا ذرا سی آنے والی آواز سے صاف یوں لگتا کہ وہ ڈھیری سے نکلنے کے جتن کر رہا ہے۔ پھر ایک تیز جھونکا آیا۔ بہت سے پتے اڑے اور مجھے محسوس ہوا کہ ڈبے کو رہائی مل گئی ہے۔ اب وہ تیزی سے لڑھکتا ہوا میرے گھر کے سامنے آ پہنچا۔ بہت جی چاہا کہ اٹھ کر اور کھڑکی کا پردہ سرکا کر اُسے دیکھوں مگر پھر یہ سوچ کر اپنے اوپر ہنسی آئی کہ ایک اچھا بھلا شخص ٹین کا خالی ڈبّا دیکھنے کے لیے گرم گرم بستر سے نکلا ہے۔

شاید ہوا کا رُخ بدلا، یا خدا جانے کیا ہوا، ڈبّا وہیں رُک گیا۔ ہوسکتا ہے وہ جو بلیاں گھروں کی دپلیزوں کے باہر رکھی ہوئی دودھ کی خالی بوتلوں کی گردنوں پر جما ہوا باسی دودھ رات بھر چائنتی پھرتی ہیں، وہ ڈبے کو چاٹ رہی ہوں۔ مگر کوکا کولا سے بلیوں کو کیا دلچسپی۔ ممکن ہے بٹیر کا ڈبّا ہو۔ مگر کیا بلیاں بٹیر پی لیتی ہیں؟ مشکل ہی ہے، لیکن برطانیہ کی بلیوں کا کیا اعتبار۔

ایک بار ہم نے قورمے کی بچی ہوئی بوٹیاں باہر ڈال دی تھیں، بلیاں حقارت سے سونگہ کر آگے بڑھ گئیں۔ پھر ایک روز جب اسکاٹ لینڈ کی گائے کے گوشت کا بچا ہوا اسٹیک باہر ڈالا تو بلیوں نے تمام رات دھینگا مُشتی مچائے رکھی۔

میری سوچوں سے بے نیاز ٹین کے خالی ڈبے نے ایک جست سی بھری اور ہوا کے سرد جھونکوں کے ساتھ لڑھکتا لڑھکتا آگے نکل گیا۔ کبھی سوکھے پتے آگے ہوتے تھے، کبھی وہ خود میں سوچنے لگا کہ گلی کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر وہ کیا کرے گا۔ بائیں جانب مڑے گا یا بڑی سڑک پار کر کے دوسری طرف اُتر جائے گا۔

اب اُس کے جانے کی آواز مدہم پڑتی جا رہی تھی مگر پتوں کے شور کے باوجود صاف تھی۔ اتنے میں باہر گلی میں تیز روشنی آئی۔ جدھر سے ڈبّا آرہا تھا ادھر سے ایک کار آئی۔ سوکھے پتوں کو کچلتی ہوئی وہ میرے گھر کے سامنے سے گزر کر آگے بڑھ گئی۔ پھر یوں لگا کہ گلی کے دوسرے کنارے پر وہ ایک لمحے کو رُکی اور کہیں چلی گئی۔

مگر اس کے بعد ایک عجیب بات ہوئی۔ ٹین کے خالی ڈبے کے لڑھکنے کی آواز آنی بند ہو گئی۔ جھونکے بھی آئے، پتے بھی اڑے لیکن ڈبے نے جیسے چُپ سادہ لی۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ جب سب کچھ چل رہا ہے تو ڈبے کا لڑھکنا کیسے رُک سکتا ہے۔

میں نے لحاف اُلٹا، بستر سے باہر نکلا اور کھڑکی کا پردہ اٹھا کر اُس طرف دیکھا جدھر ڈبّا گیا تھا لیکن مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ ہر طرف پتے ہی پتے اڑ رہے تھے۔ خیال تھا کہ ان

کی آڑ سے ڈبّا جھانکے گا۔ مگر اسے کیا پڑی تھی جو جھانکتا۔
کیا ہوا؟ میں سوچنے لگا۔ کہیں وہ کار اسے کُچلتی ہوئی تو نہیں گزر گئی؟ میں اور
سوچنے لگا۔

میرا سوچنا نہ تھا۔ رات کا ڈھلنا بھی نہ تھا۔ ذرا سی روشنی ہوئی تھی کہ میں نے
لیک کر گاؤن پہنا، سلیپریں پہنیں، دروازہ کھولا، اور باہر نکل کر وہاں جا پہنچا جہاں میرا
خیال تھا کہ کار نے ڈبّے کو کُچلا ہوگا۔ لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ کچھ سوکھے پتے تھے،
انہیں میں پیر سے ہٹانے لگا۔ پھر بھی کچھ نہ نکلا تو میں نے پہلے ایک ہاتھ سے، پھر دونوں
ہاتھوں سے پتے ہٹانے شروع کیے۔ نیچے سے اُجلی سڑک نکل آئی لیکن ٹین کا ڈبّا نہ نکلا۔
میں سڑک کے ساتھ ساتھ دور تک گیا، موڑ تک پہنچا۔ ادھر ادھر دیکھا مگر ڈبّا کہیں نہ ملا۔
واپس آکر میں نے چائے بنائی، ایک دن پرانا اخبار پڑھا اور دیر تک پچھلی کھڑکی سے
باغ کو دیکھتا رہا۔ ڈبّے کے یوں غائب ہوجانے کی گُتھی سلجھنے کے بجائے اُلجھتی جا رہی
تھی۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ جو کار گزری تھی اور گلی کے سرے پر ایک لمحے کو رکی
تھی اس میں وہ آدمی بیٹھا ہو جو کمسن بچوں کو اُٹھا لے جاتا ہے، اُن پر مجرمانہ حملہ
کرتا ہے اور پھر انہیں مار کر لاش کہیں پھینک دیتا ہے۔

ذہن نے اتنا سوچا اور بالآخر سوچنا خود ہی چھوڑ دیا۔ نیا اخبار آگیا اور دن کے
معمولات شروع ہو گئے۔

یہاں تک تو غنیمت تھا۔

اس کے بعد سے اب یہ حالت ہے کہ اکثر رات کو ایک خواب کہیں سے آجاتا ہے۔ اس
خواب میں نظر کچھ نہیں آتا، صرف آوازیں آتی ہیں، ہوا کی آوازیں، سوکھے پتے اڑنے کی
آوازیں اور ایک ڈبّے کے لڑھکنے کی آوازیں۔ ٹین کے خالی ڈبّے کی!

اب سوچتا ہوں کہ کوئی مجھے وہ ڈبّا دکھا دے۔

کُچلا ہوا ہی سہی!

